

## اختلاف امت : اسباب اور حل

مفتی محمد شفیعؒ

ہمارے معاشرہ میں مذہب کے نام پر ایک اختلاف وہ بھی ہے جو بدعت و سنت کے عنوان سے پیدا ہوا ہے۔ اس قسم کے اختلافات بلاشبہ وہ تفرق و افتراق ہیں، جن سے قرآن و سنت میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا ہے۔ ان کے ختم یا کم کرنے کی کوشش بلاشبہ مفید ہے۔ قرآن کریم نے اس کا بھی ایک خاص طریق بتایا ہے جس کے ذریعہ تفرق کی غلطی کم ہوتی چلی جائے، بڑھنے نہ پائے۔ یہ وہی اصول دعوت الی الخیر ہیں، جن میں سب سے پہلے حکمت و تدبیر، پھر خیر خواہی و ہمدردی اور نرمی کے قابل قبول عنوان سے قرآن کریم کے صحیح مفہوم کی طرف بلانا ہے، اور آخر میں مجادلہ بالمتیٰ ہی احسن یعنی حجت و دلیل کے ساتھ انہماک و تفہیم کی کوشش ہے۔ مگر افسوس کہ آج کل عام لٹل علم اور مصلحین نے ان اصولوں کو نظر انداز کر دیا۔ وہ صرف جدال میں، اور وہ بھی غیر مشروط انداز سے مشغول ہو گئے۔ یہاں تک کہ اپنے حریف کا استہزا اور تمسخر اور اس کو ذیہ کرنے کے لیے جھوٹے، سچے، جائز و ناجائز حربے استعمال کرنا اختیار کر لیا۔ اس کے نتیجہ میں جنگ و جدال کا بازار تو گرم ہو گیا، مگر اصلاح خلق کا کوئی پہلو نہ نکلا۔

افتراق امت کسے تین اسباب

مسلمانوں کے طبقات لٹل دین و اصلاح اور دینی خدمات انجام دینے والوں کے مابین جو تفرقہ آج پایا جاتا ہے وہ عموماً درج بالا حقائق کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اب میں ان اسباب و عوامل کو پیش کرتا ہوں جو میرے غور و فکر کی حد تک مسلمانوں کی باہمی آویزش اور جدال کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ اس کو خدمت دین سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے۔

۱- غلو

اس جنگ و جدال کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تخریب و تعصب، اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا، اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے، جو اٹل باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔ اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے،

اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے، کہ جو لوگ خود درجہ اجتهاد کا نہیں رکھتے وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کا اتباع کریں، اور وہ قدرتی طور پر ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف اجتہادی مسائل کی حد تک چنی تعلیمی اور عملی آسانیوں کے لیے ہو، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، نہ کوئی تفرقہ اور نہ ملت کے لیے کوئی مضرت۔

مضرت رساں اور جاہ کن ایک تو اس کا یہ منفی پہلو ہے کہ اپنی رائے سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ و جدال اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارا علم و تحقیق کا زور اور بحث و تمحیص کی طاقت اور عمر کے اوقات عزیز انہی بحثوں کی نذر ہو جائیں۔ اسی طرح نہ ان مسائل میں اختلاف رکھنے والوں پر نکیر کرنا درست ہے، نہ ان کو خطا کار مجرم ٹھہرانا صحیح ہے۔ اس وقت ہماری قوم کا برگزیدہ ترین طبقہ علماء و فقہاء کا، خصوصاً جو تعلیم و تصنیف میں مشغول ہیں، ان کی شانہ روز مشغولیت کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر حضرات کی علمی تحقیقات اور سعی و عمل کی ساری توانائی انہی فروعی بحثوں میں محدود نظر آئے گی۔

### لمحہ فکریہ

ان میں بعض حضرات کا غلو تو یہاں تک بڑھا ہوا ہے، کہ اپنے سے مختلف رائے رکھنے والوں کی نماز کو فاسد اور ان کو تارک قرآن سمجھ کر اپنے مخصوص مسلک کی اس طرح دعوت دیتے ہیں، جیسے کسی منکر اسلام کو اسلام کی دعوت دی جاتی ہو اور اسی کو دین کی سب سے بڑی خدمت سمجھے ہوئے ہیں۔

معلوم نہیں کہ یہ حضرات اسلام کی بنیادوں پر چاروں طرف سے حملہ آور طوفانوں سے باخبر نہیں، یا جان بوجھ کر اغماض برتتے ہیں۔ اس وقت لیک طرف تو کھلے ہوئے کفر، بیسائیت اور کمیونزم [سیکولر ازم] نے پورے اسلامی ممالک اور اسلامی حلقوں پر گھیرا ڈالا ہوا ہے اور یہ کفر طوفانی رفتار کے ساتھ اسلامی ممالک میں پھیل رہے ہیں۔ نوجوانوں کو بہ کثرت نئی تعلیم اور نئی معاشرت نے، دینی تعلیم اور اسلامی اصول سے اتنا دور پھینک دیا ہے کہ وہ مادی علوم و فنون کے ماہر کمانے کے باوجود مذہب اور دین کی ابتدائی معلومات سے بھی محروم کر دیے گئے ہیں۔ کھلے اور چھپے کفر کی ان ساری اقسام سے بھی اگر کچھ خوش نصیب مسلمان بچ جائیں تو فحاشی، عربیانی، رقص و سرود کی محفلوں اور گھوگر ریڈیو [موثر جدید ذرائع ابلاغ] کے ذریعہ فلمی گانوں اور سینماؤں کی زہریلی فضاؤں سے کون بے جو بچ سکے۔

دوسری طرف، ہمارے بازار جھوٹ، فریب، سود، قمار سے بھرے ہوئے ہیں، اور ان کے چلانے والے کوئی یہودی نہیں، ہندو بننے نہیں [بلکہ] اسلام کے نام لیوا ہیں۔ ہمارے

سرکاری محکمے رشوت، ظلم و جور، کام چوری، سب رحمی اور سخت دلی کی تربیت گاہیں بنے ہوئے ہیں اور ان کے کارفرما نہ انگریز ہیں، نہ ہندو، نہ یہودی [بلکہ] محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لینے والے، روز آخر پر ایمان کا دعویٰ رکھنے والے [مسلمان] ہیں۔

ان حالات میں کیا ہم پر یہ واجب نہیں کہ ہم سوچیں کہ اس وقت ہمارے آقا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ اور توقع اہل علم سے کیا ہوگی؟ اگر محشر میں آپ نے ہم سے سوال کر لیا کہ میرے دین اور شریعت پر اس طرح کے حملے ہو رہے تھے، میری امت اس بد حالی میں مبتلا تھی، تم وراثت نبوت کے دعویدار کہاں تھے؟ تم نے اس وراثت کا کیا حق ادا کیا؟ تو کیا ہمارا یہ جواب کافی ہو جائے گا کہ ہم نے رفع یدین کے مسئلہ پر ایک کتاب لکھی تھی یا کچھ طلبہ کو شرح جامی کی بحث حاصل و محصول خوب سمجھائی تھی، یا حدیث میں آنے والے اجتہادی مسائل پر بڑی دلچسپ تقریریں کی تھیں، یا صحافیانہ زور قلم اور فقرہ بازی کے ذریعے دوسرے علما و فضلا کو خوب ذلیل کیا تھا۔

فروعی اور اجتہادی مسائل میں بحث و تمحیص کوئی مذموم چیز نہیں، اگر وہ اپنی حد کے اندر، اور اخلاص سے اللہ کے لیے ہو، لیکن ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام و ایمان کی بنیادیں متزلزل کر دینے والے فتنوں کی خبر ہم سنتے ہیں۔ اللہ و رسول کے احکام کی خلاف ورزی بلکہ استہزا و تمسخر اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں، مگر ہمارے کان پر جوں نہیں ریگتی۔ تو اس کی کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ فروعی بحثیں ہم اخلاص [واقعی] کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہے ہیں۔ اگر ان میں کچھ للبیت اور اخلاص ہوتا، تو ہم ان حالات کے تحت اسلام اور دین کے تقاضوں کو پہچانتے اور قروع سے زیادہ اصول اسلام کی حفاظت میں لگے ہوتے۔ ہم نے اسلام کے اصولی اور بنیادی مسائل اور ایمان کی سرحدوں کو دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی چھوڑ دیا ہے۔ لڑنا کس محاذ پر چاہیے تھا اور ہم نے طاقت کس محاذ پر لگادی؟ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ یہ تو تخریب و تعصب کے غلو کا نتیجہ ہے۔

اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق و تشتت، باور جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ تمسخر و استہزا تک پہنچ جانا ہے، جو کسی شریعت و ملت میں روا نہیں۔ افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خدمت علم و دین کے نام پر کیا جاتا ہے۔ جب یہ معاملہ ان علما کے متعین عوام تک پہنچتا ہے تو وہ اس لڑائی کو ایک ”جماد“ قرار دے کر لڑتے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے بن دست و بازو سے ہونے لگے، اس کو کسی غنیم کی ممانعت اور کفر و الحاد کے ساتھ جنگ کی فرصت کہاں!

قرآن و حدیث میں اسی تجاوز عن الحدود کا نام تفرق ہے، جو جائز اختلاف رائے سے الگ ایک چیز ہے۔ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا**، دو سری جگہ اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ایک وصیت کا ذکر ہے جو تمام انبیاء سابقین کو کی گئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ**۔ امام ابو العالیہ نے فرمایا کہ ”اقامت دین سے مراد اخلاص ہے اور لا تَتَفَرَّقُوْا کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں عداوت نہ کرو، بھائی بھائی بن کر رہو“۔

اس وصیت کے بعد قرآن میں بنی اسرائیل کے تفرق کا بیان کر کے اہل اسلام کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ ان کے طریقہ پر نہ جائیں۔ اس میں ارشاد ہے: **وَمَا تَفَرَّقُوا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ**۔ ابو العالیہ نے اس کی تفسیر میں فرمایا کہ ”لفظ بَغْيًا بَيْنَهُمْ میں ارشاد ہے کہ ایسے اختلاف کا عداوت اور جنگ و جدل تک پہنچنا کبھی دین کے سبب سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ عداوت، جب بھی غور کرو، اس دنیا، حب مال یا حب جاہ کے سبب ہوتی ہے، جس کو نفس و شیطان خدمت دین کا عنوان دے کر مزین کر دیتا ہے (جامع العلم، ج ۲، ص ۸۴)۔ جس طرح دنیا میں انسان جب بیمار ہوتا ہے [تو وہ] اپنے معالجہ کے لیے کسی ایک حکیم یا ڈاکٹر کا انتخاب کر کے صرف اسی کے قول پر بھروسہ کرتا ہے مگر دوسرے ڈاکٹروں کو برا بھلا کہتا نہیں پھرتا ایک مقدمہ آپ کسی ایک شخص کو وکیل بنا کر اپنا مقدمہ اس کے سپرد کر دیتے ہیں، مگر دوسرے وکلاء سے لڑتے نہیں پھرتے، اجتہادی مختلف فیہ مسائل میں بھی ٹھیک یہی آپ کا طرز عمل ہونا چاہیے۔

## ۲۔ جماعتوں کا غلو

ہماری دینی جماعتیں، جو تعلیم دین، یا ارشاد و تلقین، یا دعوت و تبلیغ اور اصلاح معاشرہ کے لیے قائم ہیں، اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں۔ ان میں بہت سے علما و صلحا اور مخلصین کام کر رہے ہیں۔ اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم تعاون کرنے لگیں، اور اقامت دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و بازو سمجھے اور دوسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کہ جس جیسی اپنے کام کی کرتے ہیں، تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور تقسیم عمل کے ذریعہ اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہیں۔ مگر عموماً یہ ہو رہا ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی و عمل کا ایک دائرہ اور نظام عمل بنایا ہے، عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمت دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے ہیں۔ گو زبان سے نہ کہیں، دوسری جماعتوں سے اگر جنگ و جدل بھی نہیں تو بے قدری ضرور دیکھی جاتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشدد پٹ پٹا جاتا ہے۔

غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگرچہ دین کی اشاعت، حفاظت اور مسلمانوں کی علمی، عملی، اخلاقی اصلاح ہی ہے، اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک

مخاض سنبھالا، کسی نے دو سرا۔ ان مختلف محاذوں پر ہر جماعت نے بجا طور پر اپنے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظام عمل اور اس کے اصول و قواعد بنا رکھے ہیں اور ہر جماعت ان کی پابند ہے۔ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو منصوص اور قطعی اور قرآن و سنت سے ثابت ہے، اس سے انحراف کرنا قرآن و سنت کی حدود سے نکلنا ہے، لیکن ان کا اپنا بنایا ہوا نظام عمل اور اس کے تنظیمی اصول و قواعد نہ منصوص ہیں، نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے، بلکہ جماعت کے ذمہ داروں نے سہولت عمل کے لیے ان کو اختیار کر لیا ہے۔ ان میں حسب ضرورت تبدیلیاں وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دو سرا نظام عمل بنا لیتا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا۔ مگر [دوسری جانب] اس میں عملی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظام عمل کو مقصد منصوص کا درجہ دے دیا گیا۔ جو شخص اس نظام عمل میں شریک نہیں، اگرچہ اسی مقصد کے لیے وہ کتنا ہی عظیم کام [کیوں نہ] کر رہا ہو، اس کو اپنا بھائی، اپنا شریک کار نہیں سمجھا جاتا۔ اور اگر کوئی شخص اس نظام عمل میں شریک تھا، پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا، تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہیے، اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامت دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے۔ اس غلو کے نتیجے میں وہی تعصب اور گروہ بندی کی آلتیں اچھے خاصے دین دار لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہیں، جو جاہلی عصبتوں میں جتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔

### ۳۔ پیغمبرانہ حکمت دعوت سے پہلو تہی

تبلیغ و دعوت اور اصلاحی کوششوں کو بے کار کرنے اور تفرقہ اور جنگ و جدل کی خلیج کو وسیع کرنے میں سب سے زیادہ دخل اس کو ہے، کہ آج کل کے لٹل زبان اور اٹل قلم علما نے عموماً دعوت و اصلاح کے پیغمبرانہ طریقوں کو نظر انداز کر کے صحافیانہ زبان اور فقرے چست کرنے ہی کو بات میں وزن پیدا کرنے اور موثر بنانے کا ذریعہ سمجھ لیا ہے۔ تجربے و مشاہدے سے واضح ہے کہ یہ ایک ایسا منحوس طریقہ ہے کہ اس سے خطا کار یا گم راہ کی اصلاح کی کبھی توقع نہیں رکھی جاسکتی۔ یہ طریق کار ان کو ضد اور ہٹ دھرمی پر اور زیادہ مضبوط کر دیتا ہے، اصلاح کے بجائے دلوں میں دشمنی کے بیج بوتا ہے اور عداوت کی آگ بھڑکاتا ہے۔

ہاں، اپنے ہوا خواہوں اور معتقدین کے لیے کچھ دیر کا سامان تفریح ضرور ہو جاتا ہے اور ان کی داد سخن دینے سے لکھنے والے بھی کچھ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم نے دین کی بڑی اچھی خدمت کی ہے۔ لیکن جو لوگ اس مضمون کے مخاطب ہوتے ہیں ذرا ان کے دلوں سے پوچھیں! اگر کسی وقت ان کو اس بات کے حق ہونے کا یقین بھی ہو جائے تو کیا یہ فقرہ بازی اور تمسخر و استہزا کا طریق اس کو حق کی طرف

آنے سے مانع نہیں بن جاتا؟ اور انہیں ہمیشہ کے لیے اس داعی کا دشمن نہیں بنا دیتا ہے؟

پیغمبرانہ دعوت کسے چار عناصر

اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور پیغمبروں کی دعوت کا طریقہ ملاحظہ فرمایا جائے تو اس کے الفاظ سادہ مگر عام انسانی ہمدردی سے لبریز اور نرم ہوتے ہیں، وہ مخالفین کی سخت ترین بدکلامی سن کر بھی جواب سادہ اور نرم دیتے ہیں، فقرے نہیں کہتے، دل میں ہمدردی کا جذبہ ہوتا ہے کہ کسی طرح یہ حق بات کو قبول کر لے۔ اس کے لیے حکمت کے ساتھ تدبیروں بھی کرتے ہیں۔

پیغمبرانہ دعوت کی روح قرآن کے ایک لفظ نذیر سے سمجھی جاسکتی ہے جو ہر پیغمبر کے لیے قرآن کریم میں استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں جا بجا ان کو بشیر و نذیر کہا گیا ہے۔ لفظ نذیر کا ترجمہ اردو میں ڈرانے والے کا کیا جاتا ہے مگر ڈرانے کا لفظ نذیر کا پورا مفہوم ادا نہیں کرتا۔ اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے اس ترجمہ کو اختیار کر لیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈرانے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں [مثال کے طور پر] چور، ڈاکو کا بھی ڈرانا ہے۔ درندے اور دشمن کا بھی ڈرانا ہے اور ایک شفیق باپ بھی اپنے بچے کو بچھو، سانپ، زہر اور آگ سے ڈراتا ہے۔ پہلی قسم نری تخویف ہے۔ دوسری قسم مہربان باپ کی طرف سے ہے۔ تکلیف دہ چیزوں سے ڈرانے والے کو نذیر کہا جاتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے لیے نذیر کا لفظ استعمال فرما کر ان کی تبلیغ و تعلیم کی روح کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔ وہ صرف کوئی پیغام ہی نہیں پہنچاتے، بلکہ حکمت اور ہمدردی اور خیر خواہی سے اس پیغام کو موثر بنانے اور مخاطب کو ہلاکت سے بچانے کی پوری تدبیر اور کوشش بھی کرتے ہیں۔

قرآن کریم میں پیغمبرانہ دعوت کے جو اصول ایک آیت میں بیان کیے گئے ہیں، وہ گویا اس لفظ نذیر کی شرح ہیں۔ ارشاد باری ہے: اذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بَاتِّبِ هِيَ أَحْسَنُ۔ اس میں دعوت الی اللہ کے آداب میں سب سے پہلے بِالْحِكْمَةِ کو رکھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ داعی کا کام صرف ایک پیغام و کلام کو لوگوں کے کانوں میں ڈال دینا نہیں، بلکہ حکمت و تدبیرت، مناسب وقت، مناسب ماحول، دیکھ کر ایسے عنوان سے پہنچانا ہے کہ مخاطب کے لیے قبول کرنا آسان ہو جائے۔

دوسری چیز موعظتہ ہے، جس کے معنی ہمدردی و خیر خواہی کے ساتھ نیک کام کی طرف بلانے کے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ داعی کے لیے ضروری ہے کہ جو کلام کرے، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرے۔

تیسری چیز موعظتہ کے ساتھ حسنہ کی قید ہے اور اس میں اشارہ عنوان کو نرم اور دل نشیں بنانا ہے، کیونکہ بعض اوقات خالص ہمدردی اور خیر خواہی سے کسی کو اس کی بھلائی کی طرف بلایا جاتا ہے،

مگر عنوان اور لب و لہجہ و نعرہ ہوتا ہے، تو وہ دعوت بھی موثر نہیں ہوتی اس لیے موعظہ کے ساتھ حسنہ کی قید لگا دی۔

ایک چوتھی چیز یہ بتلائی [گئی ہے] کہ اگر دعوت کو ان آداب کے ساتھ پیش کرنے پر بھی قبول نہ کیا جائے اور نوبت مجادلہ بن کی آجائے تو پھر عامیانا انداز کا مجادلہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ بالنتی ہی احسن یعنی اچھے طریقے پر ہونا چاہیے۔ ابن کثیرؒ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: مجادلہ بھی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔ تفسیر مظہری میں فرمایا کہ مجادلہ بالنتی ہی احسن یہ ہے، کہ اس میں اپنا غصہ اتارنا یا اپنے نفس کی بڑائی پیش نظر نہ ہو، [بلکہ] خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کلمہ حق کو بلند کرنے کے لیے ہو، اور مجادلہ بالنتی ہی احسن صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ [جب] غیر مسلموں سے مجادلہ کی نوبت آئے تو اس میں بھی انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اسی کی ہدایت کی گئی ہے۔ ایک آیت میں ارشاد ہے: **وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ** یعنی کفار اہل کتاب سے مجادلہ کی نوبت آئے تو وہ بھی بالنتی ہی احسن یعنی نرمی، خیر خواہی اور حسن خطاب کے ساتھ ہونا چاہیے۔

#### انبیاء علیہم السلام کا اسوہ حسنہ

انبیاء علیہم السلام کے دعوت و اصلاح کے واقعات جو قرآن و حدیث میں بے شمار آئے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ایک کو دیکھیے تو پوری عمر کی کوششوں کو اسی انداز پر پائیں گے۔ حضرت نوح علیہ السلام سو پچاس نہیں، بلکہ نو سو برس تک جس قوم کو دعوت دیتے رہے، ہمدردی اور خیر خواہی سے سمجھاتے رہے۔ اس کے باوجود جب ان کی قوم نے سختی اور بے تندی کا معاملہ کیا، ان کو بے وقوف بتایا تو آپ کو معلوم ہے کہ اس رسول نے کیا جواب دیا: **يَقَوْمِ لَيْسَ بِي سَفَاهَةٌ وَلَكِنِّي رَسُولٌ مِّن رَّبِّ الْعَالَمِينَ** میرے بھائیو! مجھ میں کوئی بے وقوفی نہیں، بلکہ میں رب العالمین کی طرف سے رسول بنا کر تمہاری بھلائی کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

سرور کائنات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے واقعات اسی طرز کے شاہد ہیں۔ ہر طرح کی ایذاؤں سے بعد بھی ظالموں سے انتقام لینے کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کے لیے بھی دعائے خیر کی جاتی: **اهدقومی انہم لا یعلمون**۔

جن علما کو وراثت انبیاء کا کچھ حصہ ملا ہے ان سب کا بھی دعوت و تبلیغ میں یہی حال رہا ہے۔ آخری دور میں شاہ اسماعیل شہیدؒ کا واقعہ ہے کہ وہ دہلی جامع مسجد سے وعظ کر کے باہر آ رہے تھے۔ مسجد کی میزھیوں پر چند غنڈوں نے راستہ روکا اور کہا: ہم نے سنا ہے کہ آپ حرامی ہیں۔ شاہ صاحب نے نہایت طمانیت سے فرمایا: بھائی! آپ کو غلط خبر ملی ہے، میری والدہ کے نکاح کے نواہ اب تک زندہ موجود ہیں، وہ جانتے تھے کہ ان کا مقصد صرف گالی دینا اور ایذا پہنچانا ہے، مگر وارث انبیاء کا جو کام

ہونا چاہیے وہ کیا۔

طریق نبوت اور ہم

حقیقت یہ ہے کہ دعوت و اصلاح کا کام انبیاء یا ان کے وارث ہی کر سکتے ہیں، جو قدم قدم پر اپنا خون پیتے ہیں اور دشمن کی خیر خواہی اور ہمدردی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی رفتار و گفتار میں کسی مخالف پر طعن و تشنیع کا شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ مخالف کے جواب میں فقرے چست کرنے کی فکر نہیں کرتے، وہ ان پر الزام تراشی کا پہلو اختیار نہیں کرتے۔ اسی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ چند روز کی مخالفتوں کے بعد بڑے بڑے سرکشوں کو ان کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، ان کی بات کو ماننا پڑتا ہے۔ آج افسوس یہ ہے کہ ہم اسوۂ انبیاء سے اتنی دور جا پڑے کہ ہمارے کلام و تحریر میں ان کی کسی بات کا رنگ نہ رہا۔

آج کل کے مبلغ کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مخالف پر طرح طرح کے الزام لگا کر اس کو رسوا کرے، اور فقرے ایسے چست کرے کہ سننے والا دل کو پکڑ کر رہ جائے، اسی کا نام آج کی زبان میں زبان دانی اور اردو ادب ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

اللہ تعالیٰ تو اپنے انبیاء کو جب مقام دعوت پر کھڑا کرتے ہیں تو موسیٰ و ہارون علیہما السلام جیسے اولوالعزم پیغمبروں کو فرعون جیسے سرکش کافر کی طرف بھیجنے کے وقت یہ ہدایت نامہ دے کر بھیجتے ہیں: قَوْلًا لَّہٗ قَوْلًا لِّیْنَآ لَعَلَّہٗ یُتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی (فرعون سے بات نرم کرو، شاید وہ راستہ پر آجائے اور اللہ تعالیٰ سے ڈر جائے)

آج ہمارے علماء اور مصلحین و مبلغین میں کوئی حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے زیادہ ہادی اور رہبر نہیں ہو سکتا، اور ان کے مخاطب فرعون سے زیادہ گم راہ نہیں ہو سکتے تو ان کے لیے کیسے روا ہو گیا کہ جس سے ان کا کسی رائے میں اختلاف ہو جائے تو اس کی گھڑی اچھالیں اور ٹانگ کھینچنے کی فکر میں لگ جائیں اور استہز او تمسخر کے ساتھ اس پر فقرے چست کریں۔ پھر دل میں خوش ہوں کہ ہم نے دین کی بڑی خدمت انجام دی ہے اور لوگوں سے اس کے متوقع رہیں کہ ہماری خدمات کو سراہیں اور قبول کریں۔

میری نظر میں اس وقت یہ تین اسباب ہیں جو مسلمانوں کا شیرازہ بندھنے نہیں دیتے۔ ہر اجتماع کے نتیجے میں افتراق اور ہر تنظیم کے نتیجے میں تفریق، ہر اصلاح کے نتیجے میں فساد اور ہر دعوت کے نتیجے میں نفرت ہمارے سامنے آتی ہے۔ کاش، ہم مل کر سوچیں، اور دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ کیونکہ اصل مرض یہی ہے کہ حب مال و جاہ، حسد و بغض کی نجاستوں سے اپنے قلوب پاک نہیں۔ ہمیں اس پر بڑا ناز ہے کہ ہم چوری، رشوت، سود، شراب، رقص و سرود اور سینما سے پرہیز کرتے ہیں اور نماز روزے کے پابند ہیں۔ لیکن خطرہ یہ ہے کہ ہماری نماز، روزہ کی پابندی



اور سود، شراب، رقص و سرور سے پرہیز، کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف اپنی مولوی گری کے پیشے کی خاطر ہو؟ کیونکہ اس پیشے میں ان چیزوں کی کھپت نہیں۔ ورنہ اگر ہم ان چیزوں سے خالص خوف خدا کی بنا پر بچتے ہوتے تو حُبِ مال و جاہ، حسد و بغض، کبر و ریا سے بھی بچتے ہوتے، کیونکہ ان کی نجاست کچھ سود و شراب سے کم نہیں، مگر [چونکہ] یہ باطنی گناہ ہمارے بچے اور عمامے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں، اس لیے ان کی پروا نہیں ہوتی۔ یہی وہ چیزیں ہیں، جو دراصل سارے تفرقوں کی بنیاد ہیں۔

علمائے کرام سے گزارش

اہل نظر و فکر سے یہ بات مخفی نہیں کہ اس وقت دنیا کے ہر خطہ اور ہر ملک میں مسلمان جن مصائب اور آفات میں مبتلا ہیں، ان کا سب سے بڑا آپس کا تفرقہ اور خانہ جنگی ہے۔ ورنہ عددی اکثریت اور مادی اسباب کے اعتبار سے پوری تاریخ اسلام میں کسی وقت بھی مسلمانوں کو اتنی عظیم طاقت حاصل نہیں تھی، جتنی آج ہے۔

اس تفرقہ کے اسباب پر جب غور کیا جاتا ہے تو اس کا سبب خدا اور آخرت سے غفلت اور دوسری قوموں کی طرح صرف دنیا کی چند روزہ مال و دولت اور عزت و جاہ کی ہوس بے لگام ہے۔ یہ ہمارے معاشرے میں کبھی سیاسی اقتدار کے لیے کش مکش، تجارتی اور صنعتی ریس، عہدوں اور منصبوں کی خاطر باہمی تصادم کی صورت میں ہمارے معاشرے کو پارہ پارہ کرتی ہے۔ کبھی یہ مذہبی اور دینی نظریات کی آڑ اور مختلف نظاموں کے روپ میں ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اہانت و استہزا پر اکسا کر ہماری بربادی و تفرقہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وگرنہ اجتہادی نظریات کے باہمی اختلاف کے باوجود صحابہؓ و تابعینؓ کی طرح ہماری جنگ کا رخ صرف کفر و الحاد اور بے وینگی کی طرف ہو جائے اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی مختلف جماعتیں ایک صف اور ایک بنیان مرصوص نظر آئیں۔

سیاسی اور اقتصادی میدان اور اعزاز و منصب کی دوڑ میں بے اعتدالیوں کی روک تھام تو سردست ہمارے بس میں نہیں۔ لیکن خود دین و مذہب کے لیے کام کرنے والی جماعتوں کے نظریاتی اختلافات، اشتراک مقصد کی خاطر معتدل کیے جاسکتے ہیں۔ اگر ہم ”اسلام کے بنیادی اصول کی حفاظت اور الحاد بے وینگی کے سیلاب کی مدافعت“ کے اہم مقصد کو صحیح معنی میں اصلی مقصد سمجھ لیں، تو یہ نکتہ وحدت ہے کہ جس پر مسلمانوں کے سارے فرقے، ساری جماعتیں جمع ہو کر کام کر سکتی ہیں اور اسی وقت اس سیلاب کے مقابلے میں کوئی موثر کام انجام پاسکتا ہے۔

لیکن حالات کا جائزہ یہ جاتا ہے کہ یہ اصلی مقصد ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے، اس لیے ہماری ساری توانائی اور علم و تحقیق کا زور آپس کے اختلافی مسائل پر صرف ہوتا ہے۔ وہی ہمارے وعظوں، جلسوں، رسالوں اور اخباروں کا موضوع بحث بنتے ہیں۔ ہمارے اس عمل سے عوام یہ سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ دین اسلام صرف ان دو چیزوں کا نام ہے۔ جس رخ کو انھوں نے

اختیار کر لیا ہے، اس کے خلاف کو گمراہی اور اسلام دشمنی سے تعبیر کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ہماری وہ طاقت جو کفر و الحاد اور بے دینی اور معاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی کے مقابلہ پر خرچ ہوتی آپس کی جنگ و جدل میں خرچ ہونے لگتی ہے۔

اسلام و ایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے، وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا نظر آتا ہے۔ ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پر ہے۔ اعمال و اخلاق برباد ہیں۔ معاملات و معاہدات میں فریب ہے۔ سود، قمار بازی، شراب، خنزیر، بے حیائی، بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء کے جائز وارث اور ملک و ملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے، اس سے آدھا بھی خدا کے ان باغیوں پر کیوں نہیں آتا؟ اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوش ایمانی کا اظہار ہوتا ہے، وہ ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا؟ ہمارا زور زبان اور زور قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جماد کرتا ہے، اس کا کوئی حصہ سرحدوں اور اصول ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلے میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیانِ مروض کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر غور کیوں نہیں کرتے کہ بعثت انبیا اور نزول قرآن کا وہ مقصد عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور جس نے غیروں کو اپنا بنایا، جس نے اولادِ آدم کو ہیبت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا، اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، کیا وہ صرف یہی مسائل تھے جن میں ہم الجھ کر رہ گئے ہیں؟ کیا دو سروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے؟ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَاَلَمْ يَأْنِ لَكُمْ اَنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي هُوَ الْخَاقِيَةُ الَّذِي اُنزِلَ مِنَ السَّمَاءِ الْحَقُّ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ الَّذِي لَمْ يَلِكْ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَا اللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَلِيمِ اَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا اَنْ يَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَاَلَمْ يَأْنِ لَكُمْ اَنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي هُوَ الْخَاقِيَةُ الَّذِي اُنزِلَ مِنَ السَّمَاءِ الْحَقُّ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ الَّذِي لَمْ يَلِكْ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ سِوَا اللَّهِ الْعَلِيِّ الْعَلِيمِ

اب بھی وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کی طرف جھک جائیں۔“

آخر وہ کون سا وقت آئے گا جب ہم اپنے نظریاتی اور نظامی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصولِ اسلام کی حفاظت اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فرض سمجھیں گے؟ ملک میں [بے دینی اور بد اخلاقی] کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی خبر لیں گے؟

اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں ہمارے ماویٰ اور بھائیوں کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے یہ سوال فرمایا: میری شریعت اور میرے دین پر یہ حملے ہو رہے تھے۔ اسلام کے نام پر کفر پھیلایا جا رہا تھا۔ میری امت کو میرے دشمنوں کی امت بنانے کی کوشش مسلسل جاری تھی۔ قرآن و سنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی، خدا اور رسول کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی۔ [اس وقت] تم مدعیانِ علم کہاں تھے، تم نے اس کے مقابلہ پر کتنی محنت اور قربانی پیش کی؟ کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستے پر

لگایا؟ آج ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا کیا جواب ہو گا!

راہ عمل

اس لیے ملت کا درد اور اسلام و ایمان کے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے علما حضرات سے دردمندانہ گزارش یہ ہے کہ مقصد کی اہمیت اور نزاکت کو سامنے رکھ کر سب سے پہلے تو اپنے دلوں میں اس کا عہد کریں کہ اپنی علمی و عملی صلاحیت اور زبان و قلم کے زور کو زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں گے، جس کی حفاظت کے لیے قرآن و حدیث آپ کو بلا رہے ہیں۔

۱۔ علما کرام اس بات کا عہد بھی کریں اور فیصلہ بھی، کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں سے زیادہ سے زیادہ اس محاذ پر لگائیں گے، جس کی حفاظت کے لیے قرآن و حدیث آپ کو بلا رہے ہیں۔

۲۔ علما کرام، اس بات کا عہد بھی کریں اور فیصلہ بھی، کہ اس کام کے لیے اپنے موجودہ مشاغل میں سے زیادہ سے زیادہ وقت نکالیں گے۔

۳۔ آپس کے نظریاتی اور اجتہادی اختلاف کو صرف اپنے اپنے حلقہ درس اور تصنیف و تالیف اور فتوے تک محدود رکھیں گے۔ عوامی جلسوں، اخباروں، اشتہاروں، باہمی مناظروں اور جھگڑوں کے ذریعہ ان کو نہ اچھالیں گے، ان حلقوں میں بھی پیغمبرانہ اصول دعوت و اصلاح کے تابع رہتے ہوئے دلخراش عنوان اور طعن و تشنیع استہزا و تمسخر اور صحافیانہ فقرہ بازی سے گریز کریں گے۔

۴۔ معاشرہ میں پھیلی ہوئی بیماریوں کی اصلاح کے لیے دلنشین عنوان اور مشفقانہ لب و لہجہ کے ساتھ کام شروع کر دیں گے۔

۵۔ الحاد و بے دینی اور تحریف قرآن و سنت کے مقابلہ کے لیے پیغمبرانہ اصول دعوت کے تحت حکیمانہ تدبیروں و مشفقانہ، ناصحانہ بیانیوں اور دلنشین دلائل کے ذریعہ مجادلہ باللہی ہی احسن کے ساتھ اپنے زور زبان اور زور قلم کو وقف کر دیں گے۔

میں جو کچھ کہہ گیا ہوں افسوس کہ نہ میرا منصب تھانہ علما کرام کے سامنے مجھے ایسی جرات کرنا چاہیے تھی، مگر دکھی دل کے کچھ کلمات ہیں جو زبان پر آگئے۔ میرے محترم بزرگ مجھے معاف فرمائیں اور اگر ان باتوں میں کوئی مفید پہلو ہے تو وہ خود ان کا اپنا کام ہے اس کو اختیار فرمائیں۔ مجھے امید ہے کہ اگر علما اس طرف متوجہ ہو گئے اور کام شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ اِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ (یعنی اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا) آنکھوں سے پورا ہوتا ہوا مشاہدہ کریں گے۔

اِنْ اُرِيدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيبُ